برگِ آوارہ

حبیب جالب

آزاد بک ڈپو ہال بازار امرتسر

ناشر: آزاد بک ڈپو امرتسر
قیمت: 10/50
مطبع:
کتابت: دیوان چند مونگا دہلی

احمد ریاض کے نام ———

قسمت پہ ناز ہے تو اِسی اعتبار سے
دل کو رہی ہے راہ سدا کوئے یار سے

ایسی غزل کہی نہ کہیں گے تمام عمر
انعام و داد جس پہ ملے شہر یار سے

جس پر تھا اِک ہجوم کبھی اہلِ شوق کا
تنہا گزر رہے ہیں اب اُس رہگزار سے

ترکِ وفا کا دل میں نہ آنے دیا خیال
اس آئینے کو ہم نے بچایا غبار سے

کچھ اور ہو گیا ہے وہ شاعر نہیں رہا
وابستہ ہو گیا جو کسی تاجدار سے

گزشتہ چند برسوں میں اردو غزل نے متعدد پہلوؤں سے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کی ہیں۔ ہر اچھا غزل گو ایک نئی غزل کہہ کر فکر اور اسلوب اظہار کے سلسلے میں اردو غزل کے خدوخال میں ایک نیا نکھار پیدا کر دیتا ہے کسی نے حقائق حیات کو غزل کی زبان میں سمو کر اس دلآویز صنف شعر کے امکانات میں وسعتیں پیدا کی ہیں۔ کسی نے غزل کو محض چند معینہ جذبات کے خول میں بند رکھنے کے بجائے اس میں فکر و تامل کے چراغ جلائے ہیں۔ کسی نے شعر کے منطقی جادو میں منطق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور کسی کا سرمایۂ فن زبان و بیان کے نئے تیور ہیں۔ حبیب جالب نے اپنی غزلوں میں سلاست اور غنائیت پر زور دیا ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں خاصی گمراہ کن ہیں۔ سلاست کو بعض لوگوں۔ الفاظ کی نشست و برخاست کا ایک شعبدہ بنا ڈالا ہے اور غنائیت کو ایک ڈھکوسلا۔ ان دنوں یہ رو ہمارے ہاں خاصے زور سے چل رہی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں بہت اچھی اور سچ مچ کی غزلیں لکھی جا رہی ہیں وہاں بے شمار ایسی غزلیں بھی شائع ہو رہی ہیں جن کی تخلیق کے لئے اگر کچھ چاہیے تو وہ صرف وزن کا احساس ہے یا الفاظ کی

ایسی ترتیب کا، جس سے لمحاتی طور پر ایک کوندا سا لپک جائے مگر غور کیجئے تو جیسے پڑھنے یا سننے والے کو احمق بنایا گیا ہے۔ حبیب جالب نے غزل میں سلاست اور غنائیت پر صحت مندانہ انداز میں زور دیا ہے اس نے سلاست کو مفہوم کے چمکانے اور غنائیت کو شعر کے تاثر میں اضافے کے لئے بڑی چابکدستی سے استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حبیب جالب کی غزلیں چاہے سنی جائیں چاہے پڑھی جائیں، ان کا تاثر یکساں ہوتا ہے اور یہ تاثر دل کے گداز، ذہن کے اجالے، ایک کسک اور ایک چمک کا مرکب ہوتا ہے۔ حبیب جالب کا فنی مزاج غزل کا مزاج ہے اور اس لئے وہ اُردو کے نئے غزل گوؤں میں نمایاں حیثیت کا مالک ہے۔

حبیب جالب کی نظموں اور بعض غزلوں کے اکا دکا اشعار میں تلخی اور طیش کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے لیکن یہ اس کے فن کا نقص نہیں ہے، اس کے فنی خلوص کا احتجاج ہے اور جس فن کار کو احتجاج کا حوصلہ نہیں ہوتا وہ خود فن کی بے حرمتی پر بھی صرف آنکھیں جھپک کر رہ جاتا ہے!

احمد ندیم قاسمی

○

آج اس شہر میں کل نئے شہر میں بس اسی لہر میں،
اُڑتے پتّوں کے پیچھے اُڑاتا رہا شوقِ آوارگی

اس گلی کے بہت کم نظر لوگ تھے فتنہ گر لوگ تھے
زخم کھاتا رہا مسکراتا رہا شوقِ آوارگی

کوئی پیغام گل تک نہ پہنچا مگر پھر بھی شام و سحر
نازِ بادِ چمن کے اُٹھاتا رہا شوقِ آوارگی

کوئی ہنس کے ملے غنچۂ جاں کھلے چاکِ دل کا سلے
ہر قدم پر نگاہیں بچھاتا رہا شوقِ آوارگی

دشمنِ جاں فلک غیر ہے یہ زمیں، کوئی اپنا نہیں
خاک سارے جہاں کی اُڑاتا رہا شوقِ آوارگی

○

دل کی بات لبوں پر لا کر اب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا تھا اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں

بیت گیا ساون کا مہینہ موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دُنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا جن کے لیے بدنام ہوئے
آج وُہی ہم سے بیگانے بیگانے سے رہتے ہیں

وہ جو ابھی اس راہگزر سے چاک گریباں گزرا تھا
اس آوارہ دیوانے کو جالب جالب کہتے ہیں

○

ہم آوارہ گاؤں گاؤں بستی بستی پھرنے والے
ہم سے پریت بڑھا کر کوئی مفت میں کیوں غم کو اپنا لے

یہ بھیگی بھیگی برساتیں، یہ مہتاب یہ روشن راتیں
دِل ہی نہ ہو تو جھوٹی باتیں کیا اندھیالے کیا اجیالے

غنچے روئیں کلیاں روئیں رو رو اپنی آنکھیں کھوئیں
چین سے لمبی تان کے سوئیں اس پھلواری کے رکھوالے

درد بھرے گیتوں کی مالا جپتے جپتے جیون گزرا
کس نے سُنی ہیں کون سُنے گا دِل کی باتیں دِل کے نالے

یہ اور بات تیری گلی میں نہ آئیں ہم
لیکن یہ کیا کہ شہر ترا چھوڑ جائیں ہم

مدّت ہوئی ہے کوئے بتاں کی طرف گئے
آوارگی سے دِل کو کہاں تک بچائیں ہم

شاید بقیدِ زیست یہ ساعت نہ آسکے
تم داستانِ شوق سُنو اور سُنائیں ہم

بے نُور ہو چکی ہے بہت شہر کی فضا
تاریک راستوں میں کہیں کھو نہ جائیں ہم

اس کے بغیر آج بہت جی اُداس ہے
جالبؔ چلو کہیں سے اُسے ڈھونڈ لائیں ہم

○

پھر کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے
ہم تِرا شہر چھوڑ جائیں گے

دُور اُفتادہ بستیوں میں کہیں
تیری یادوں سے لَو لگائیں گے

شمعِ ماہ و نجُوم گُل کر کے
آنسوؤں کے دِیے جلائیں گے

آخری بار اِک غزل سُن لو
آخری بار ہم سُنائیں گے

صُورتِ موجۂ ہوا جالبؔ
ساری دُنیا کی خاک اُڑائیں گے

○

محبّت کی رنگینیاں چھوڑ آئے
ترے شہر میں اِک جہاں چھوڑ آئے

پہاڑوں کی وہ مست و شاداب وادی
جہاں ہم دلِ نغمہ خواں چھوڑ آئے

وہ سبزہ وہ دریا وہ پیڑوں کے سائے
وہ گیتوں بھری بستیاں چھوڑ آئے

حسیں پنگھٹوں کا وہ چاندی سا پانی
وہ برکھا کی رُت وہ سماں چھوڑ آئے

بہت دُور ہم آ گئے اُس گلی سے
بہت دُور وہ آستاں چھوڑ آئے

بہت مہرباں تھیں وہ گل پوش راہیں
مگر ہم انہیں مہرباں چھوڑ آئے

بگولوں کی صورت یہاں پھر رہے ہیں
نشیمن سرِ گلستاں چھوڑ آئے

یہ اعجاز ہے حُسنِ آوارگی کا
جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے

چلے آئے ان رہگزاروں سے جالب
مگر ہم وہاں قلب و جاں چھوڑ آئے

○

لوک گیتوں کا نگر یاد آیا
آج پردیس میں گھر یاد آیا

جب چلے آئے چمن زار سے ہم
التفاتِ گلِ تر یاد آیا

تیری بیگانہ نگاہی سرِ شام
ہم زمانے کے ستم بھول گئے
جب ترا لطفِ نظر یاد آیا

تو بھی مسرور تھا اُس شب سرِ بزم
اپنے شعروں کا اثر یاد آیا

پھر ہوا دردِ تمنّا بیدار
پھر دلِ خاک بسر یاد آیا

ہم جسے بھول گئے تھے جالبؔ
پھر وہی راہ گزر یاد آیا

○

جاگ اُٹھے سوئے ہوئے درد تمناؤں کے
راستے ذہن میں لہرا گئے اس گاؤں کے

اِک تری یاد سے اِک تیرے تصوّر سے ہمیں
آگئے یاد کئی نام حسیناؤں کے

صبح سے شام تلک گرم ہوا چلتی ہے
دن بہت سخت ہیں تپتے ہُوئے صحراؤں کے

اِس کڑی دُھوپ میں یاد آتے ہیں تڑپاتے ہیں
ہم کو احساں درختوں کی گھنی چھاؤں کے

وہ حسیں پھُول وُہ سبزہ وہ فسوں ساز دیار
وہ مدھر گیت محبّت بھرے دریاؤں کے

جانے کِس حال میں ہیں کون بتائے جالبؔ
ارضِ پنجاب میں پودے میری آشاؤں کے

○

اس دیس کا رنگ انوکھا تھا اس دیس کی بات نرالی تھی
نغموں سے بھرے دریا تھے رواں گیتوں سے بھری ہریالی تھی

اُس شہر سے ہم آجائیں گے اشکوں کے دیپ جلائیں گے
وہ دَور بھی آنے والا تھا یہ بات بھی ہونے والی تھی

وہ روشن گلیاں یاد آئیں وہ پھول وہ کلیاں یاد آئیں
سُندر من چلیاں یاد آئیں ہر آنکھ مدھر متوالی تھی

کس بستی میں آپہنچے ہم ہر گام پہ ملتے ہیں سو غم
پھر چل اس نگری میں ہمدم ہر شام جہاں اُجیالی تھی

وہ بام و در وہ راہ گزر دل خاک بسر جاں خاک بسر
جالبؔ وہ پریشاں حالی بھی کیا خوب پریشاں حالی تھی

○

ہر گام پر تھے شمس و قمر اُس دیار میں
کتنے حسیں تھے شام و سحر اس دیار میں

وہ باغ وہ بہار وہ دریا وہ سبزہ زار
نشّوں سے کھیلتی تھی نظر اس دیار میں

آسان تھا سفر کہ ہر اک راہ گزار پر
ملتے تھے سایہ دار شجر اس دیار میں

ہر چند تھی وہاں بھی خزاں کی اُداس دھوپ
دل پر نہیں تھا غم کا اثر اس دیار میں

محسوس ہو رہا تھا ستارے ہیں گردِ راہ
ہم تھے ہزار خاک بسر اس دیار میں

جالب یہاں تو بات گریباں تک آ گئی
رکھتے تھے صرف چاک جگر اس دیار میں

پھر دل سے آرہی ہے صدا اس گلی میں چل
شاید ملے غزل کا پتا اس گلی میں چل

کب سے نہیں ہوا ہے کوئی شعر کام کا
یہ شعر کی نہیں ہے فضا اس گلی میں چل

وہ بام و در وہ لوگ وہ رسوائیوں کے زخم
ہیں سب کے سب عزیز جدا اس گلی میں چل

اس پھول کے بغیر بہت جی اداس ہے
مجھ کو بھی ساتھ لے کے صبا اس گلی میں چل

دنیا تو چاہتی ہے یونہی فاصلے رہیں
دنیا کے مشوروں پہ نہ جا اس گلی میں چل

بے نور و بے اثر ہے یہاں کی صدائے ساز
تھا اس سکوت میں بھی مزا اس گلی میں چل

جالبؔ پکارتی ہیں وہ شعلہ نوائیاں
یہ سرد رُت یہ سرد ہوا اس گلی میں چل

بجلیوں کی یورش سے شاخ شاخ لرزاں ہے
کیا یہی بہاراں ہے کیا یہی گلستاں ہے

آج بھی نگاہوں سے وحشتیں نہیں جاتیں
آج بھی نگاہوں میں کائنات ویراں ہے

تیرے گیسوؤں ہی پر میری جاں نہیں موقوف
ذرہ ذرہ ہستی کا آج کل پریشاں ہے

مل ہی جائے گی منزل کٹ ہی جائے گی مشکل
اے مرے نئے ساتھی کس لیے ہراساں ہے

○

گلشن کی فضا دُھواں دُھواں ہے
کہتے ہیں بہار کا سماں ہے

بکھری ہوئی پتّیاں ہیں گُل کی
ٹوٹی ہوئی شاخِ آشیاں ہے

جس دل سے اُبھر رہے تھے نغمے
پہلو میں وہ آج نوحہ خواں ہے

ہم ہی نہیں پائمال تنہا
اے دوست! تباہ اک جہاں ہے

جاں سوز وہ کہاں ہے عشق تیرا
پیارے وہ غزل تری کہاں ہے

مہتاب صفت لوگ یہاں خاک بسر ہیں

ہم محوِ تماشائے سرِ راہ گزر ہیں

حسرت سی برستی ہے در و بام پہ ہر سُو

روتی ہُوئی گلیاں ہیں سسکتے ہُوئے گھر ہیں

آئے تھے یہاں جن کے تصوّر کے سہارے

وہ چاند وہ سُورج وہ شب و روز کِدھر ہیں

سوئے ہو گھنی زُلف کے سائے میں ابھی تک

اے راہروں کیا یہی اندازِ سفر ہیں

وہ لوگ قدم جن کے لیے کاہکشاں نے

وہ لوگ بھی اے ہمنفسو ہم سے بشر ہیں

بِک جاتے جو ہر شخص کے ہاتھوں سرِ بازار

ہم یوسفِ کنعاں ہیں نہ ہم لعل و گہر ہیں

ہم لوگ ملیں گے تو محبت سے ملیں گے

ہم نکہتِ مہتاب ہیں ہم نورِ سحر ہیں

○

شہر ویراں اُداس ہیں گلیاں
رہگزاروں سے اُٹھ رہا ہے دھواں
آتشِ غم میں جل رہے ہیں دیار
گرد آلود ہے رُخِ دوراں
بستیوں پر غموں کی یورش ہے
قریہ قریہ ہے وقفِ آہ و فغاں
صبح بے نور، شام بے مایہ
لُٹ گئی دولتِ نگاہ کہاں
پھر رہے ہیں ظلمتوں آوارہ
برق ہر شاخ پر ہے شعلہ فشاں
میری تنہائیوں پہ صورتِ شمع
رو رہا ہے الم نصیبہ سماں
میرے شانوں سے تیری لغزش تک
فاصلہ عمر کا ہے میری جاں

○

اگر دامن نہیں ان کا میسّر

کسی دیوار ہی سے لگ کے رو لیں

ملے رونے سے فرصت تو کسی شب

ستاروں کی حسیں چھاؤں میں سو لیں

نگاہوں کی زباں کوئی جو سمجھے

سرِ محفل کبھی ہم لب نہ کھولیں

بہت آسان ہو جائے گی منزل

چلو ہم ہی کسی کے ساتھ ہو لیں

کوئی جو آ بسے دل میں تو جالبؔ

کبھی اس گھر کے دروازے نہ کھولیں

○

اِس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں، یہی بات بڑی بات ہے پیارے
یہ ہنستا ہوا چاند یہ پُر نُور ستارے
"تابندہ و پائندہ ہیں ذرّوں کے سہارے"
حسرت ہے کوئی غنچہ ہمیں پیار سے دیکھے
ارماں ہے کوئی پھول ہمیں دل سے پکارے
ہر صبح مری صبح پہ روتی رہی شبنم
ہر رات مری رات پہ ہنستے رہے تارے
کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غمِ جاناں
کب تک کوئی اُلجھی ہوئی زُلفوں کو سنوارے

ہم نے سُنا تھا صحنِ چمن میں کیف کے بادل چھائے ہیں
ہم بھی گئے تھے جی بہلانے اشک بہا کر آئے ہیں

پھول کھلے تو دل مرجھائے شمع جلے تو جان جلے
ایک تمہارا غم اپنا کر کتنے غم اپنائے ہیں

ایک سلگتی یاد، چمکتا درد، فروزاں تنہائی
پُوچھ نہ اس کے شہر سے ہم کیا کیا سوغاتیں لائے ہیں

سوئے ہوئے جو درد تھے دل میں آنسو بن کر بہ نکلے
رات ستاروں کی چھاؤں میں یاد وہ کیا کیا آئے ہیں

آج بھی سُورج ڈوب گیا بے نُور اُفق کے ساگر میں
آج بھی پھُول چمن میں تجھ کو بن دیکھے مُرجھائے ہیں

ایک قیامت کا سنّاٹا ایک بلا کی تاریکی
اُن گلیوں سے دُور نہ ہنستا چاند نہ روشن سائے ہیں

پیار کی بولی بول نہ جالبؔ اس بستی کے لوگوں سے
ہم نے سکھ کی کلیاں کھو کر دُکھ کے کانٹے پائے ہیں

O

جب کوئی کلی صحنِ گلستاں میں کھلی ہے
شبنم مری آنکھوں میں وہیں تیر گئی ہے

جس کی سرِ افلاک بڑی دھوم مچی ہے
آشفتہ سری ہے، مری آشفتہ سری ہے

اپنی تو اُجالوں کو ترستی ہیں نگاہیں
سورج کہاں نکلا ہے کہاں صبح ہوئی ہے

ہم کشمکشِ دیر و حرم سے ہیں بہت دور
انسان کی عظمت پہ نظر اپنی رہی ہے

بچھڑی ہوئی راہوں سے جو گزرے ہیں کبھی ہم
ہر گام پہ کھوئی ہوئی اک یاد ملی ہے

اک عمر سنائیں تو حکایت نہ ہو پوری
دو روز میں ہم پر جو یہاں بیت گئی ہے

تم سادہ و معصوم ہو اور ہم ہیں گنہگار
دُنیا کی نگاہوں سے کہیں بات چھپی ہے

ہنسنے پہ نہ مجبور کرو، لوگ ہنسیں گے
حالات کی تفسیر تو چہرے پہ لکھی ہے

دیکھا ہے زمانے کو گلے ہم نے لگا کر
سینہ تری دُنیا کا محبّت سے تہی ہے

وہ بھُول گئے ہم کو، انہیں بھول گئے ہم
اے دوست مگر دل میں خلش اب بھی دبی ہے

مِل جائیں کہیں وہ بھی تو ان کو بھی سنائیں
جالبؔ یہ غزل جن کے لئے ہم نے کہی ہے

○

کبھی تو مہرباں ہو کر بلا لیں

یہ مہوش ہم فقیروں کی دعا لیں

نجانے پھر یہ رت آئے نہ آئے

جواں پھولوں کی کچھ خوشبو چرا لیں

بہت روئے زمانے کے لئے ہم

ذرا اپنے لئے آنسو بہا لیں

ہم ان کو بھولنے والے نہیں ہیں

سمجھتے ہیں غمِ دوراں کی چالیں

ہماری بھی سنبھل جائے گی حالت

وہ پہلے اپنی زلفیں تو سنبھالیں

نکلنے کو ہے وہ مہتاب گھر سے
ستاروں سے کہو نظریں جھکائیں
ہم اپنے راستے پر چل رہے ہیں
جنابِ شیخ اپنا راستہ لیں
زمانہ تو یونہی رُوٹھا رہے گا
چلو جالبؔ اُنہیں چل کر منالیں

○

سُونی ہیں آنکھوں کی گلیاں دل کی بستی ویراں ہے
ایک خموشی ایک اندھیرا چاروں جانب رقصاں ہے
کتنی دُور چلا آیا ہوں چھوڑ کے تیری بستی کو
لیکن دل تیری گلیوں میں آج تلک سرگرداں ہے
پھر سُورج کے ساتھ ترے ملنے کا امکاں ڈوب گیا
پھر بام و در کی تاریکی دیدہ و دل پر خنداں ہے
پھر ان پیار بھری نابیوں کی یاد میں آنکھیں پُرنم ہیں
پھر اس بچھڑے دیس کے غم میں شہرِ دل و جاں ویراں ہے
جاؔلب آپ اس جانِ غزل کے پیار سے لاکھ انکار کریں
آنکھوں کی پُرسوز چمک سے دل کا درد نمایاں ہے

دل والو کیوں دل سی دولت یُوں بیکار لٹاتے ہو
کیوں اس اندھیاری بستی میں پیار کی جوت جگاتے ہو

تم ایسا نادان جہاں میں کوئی نہیں ہے کوئی نہیں
پھر اُن گلیوں میں جاتے ہو پگ پگ ٹھوکر کھاتے ہو

سُندر کلیو کومل پھولو یہ تو بتاؤ یہ تو کہو!
آخر تم میں کیا جادُو ہے کیوں من میں بس جاتے ہو

یہ موسم، رِم جھم کا موسم، یہ برکھا یہ مست فضا
ایسے میں آؤ تو جانیں، ایسے میں کب آتے ہو

ہم سے رُوٹھ کے جانے والو اِتنا بھید بتا جاؤ
کیوں نت راتوں کو سپنوں میں آتے ہو من جاتے ہو

چاند ستاروں کے جُھرمٹ میں پھولوں کی مُسکاہٹ میں
تم چھپ چھپ کر ہنستے ہو تم رُوپ کا مان بڑھاتے ہو

چلتے پھرتے روشن رستے تاریکی میں ڈُوب گئے
سو جاؤ اب جالبؔ تم بھی کیوں آنکھیں سُلگاتے ہو

○

میں چُپ ہُوں ذرا ڈوبتے خورشید سے پُوچھو
کِس کرب سے کِس حال میں کِس طور کٹا دِن

لو آج بھی کم ہو نہ سکی یاس کی ظلمت
لو آج بھی بیکار گیا آس بھرا دِن

یہ شہر جہاں ہم ہیں، یہاں کون ہے اپنا
یہ بات ہی کیا کم ہے یہاں بیت گیا دِن

یہ کون سی بستی ہے جہاں چاند نہ سُورج
کِس درجہ بُری رات ہے، کِس درجہ بُرا دِن

ظلمت کدۂ زیست میں پھر دیکھئے کب آئے
تیرے لب و رخسار سے شرمایا ہُوا دِن

اُس شہر سے دُور آکے جو دن دیکھ رہے ہیں
دشمن کو بھی ایسے تو دکھائے نہ خدا دِن

○

وہ جن کی رفعتوں کے سامنے ہے گردِ آسماں
ترے دیار میں ہیں صورتِ متاعِ رائگاں
یہیں ٹھہر یہیں ٹھہر میں آ رہا ہوں میری جاں
بلا رہا ہے اک ذرا سی دیر کو غمِ جہاں
فریبِ رنگ و بو نہ کھا ابھی چمن چمن کہاں
ابھی تو شاخ شاخ پر چمک رہی ہیں بجلیاں
چلو دیارِ نغمہ و شباب میں پناہ لیں
سمٹ کے آ گئی ہیں دل میں سب جہاں کی تلخیاں
چلو غزل کے شہر میں چلو طرب کے دیس میں
چلو نگاہ کو نگاہ کی سنائیں داستاں

○

کیا کیا لوگ گزر جاتے ہیں رنگ برنگی کاروں میں
دل کو تھام کے رہ جاتے ہیں دل والے بازاروں میں

یہ بیدرد زمانہ ہم سے تیرا درد نہ چھین سکا
ہم نے دل کی بات کہی ہے تیروں میں تلواروں میں

ہونٹوں پہ آہیں کیوں ہوتیں آنکھیں نمناک کیوں ہوتیں
کوئی اگر اپنا بھی ہوتا اونچے عہدیداروں میں

صدرِ محفل داد نہ دے دے داد اُسی کو ملنی ہے
ہائے کہاں ہم آن پھنسے ہیں ظالم دنیاداروں میں

رہنے کو گھر بھی مل جاتا اک جگہ بھی مل جاتا
جالبؔ تم بھی شعر سناتے جا کے اگر درباروں میں

○

کٹی اب کٹی منزلِ شامِ غم
بڑھائے چلو پا فگارو قدم

ہمیں سے فروزاں ہے شمعِ وفا
ہمیں نے بھرا ہے محبت کا دم

کہیں یاس کے حوصلے بڑھ نہ جائیں
کہیں آس کے رُک نہ جائیں قدم

پڑھے گا زمانہ بڑے شوق سے
کیے جاؤ دل کی کہانی رقم

بدل جائے گا دیکھتے دیکھتے
یہ عہدِ خرابی، یہ عہدِ ستم

نکلنے کو ہے آفتابِ سحر
شبِ تار ہے بس کوئی اور دم

مٹا کر اندھیروں کا نام و نشاں
اُجالوں کی بستی بسائیں گے ہم

○

شب کو چاند اور دن کو سُورج بن کر رُوپ دکھاتی ہو
پل چھن آنکھوں کی گلیوں میں تم آنچل لہراتی ہو

تم سے جگ اُجیارا سارا روشن بستی بستی ہے
سانجھ سویرے ڈیرے ڈیرے جیون جوت جگاتی ہو

کتنی روشن ہے تنہائی جب سے یہ معلوم ہُوا
میرے لیے اپنی پلکوں پر تم بھی دیپ جلاتی ہو

اے میری انمول غزل یہ بات بھی تجھ تک پہنچی ہے
یارانِ لاہور میں اب تک تم میری کہلاتی ہو

میرؔ ہو غالبؔ ہو یا جالبؔ گیت تمہارے گاتے ہیں
سب کے شعروں میں تم اپنی سُندر چھب دکھلاتی ہو

اب تیری ضرورت بھی بہت کم ہے مری جاں
اب شوق کا کچھ اور ہی عالم ہے مری جاں

اب تذکرۂ خندۂ گل بار ہے جی پر
جاں وقفِ غمِ گریۂ شبنم ہے مری جاں

رُخ پر ترے بکھری ہوئی یہ زُلفِ سیہ تاب
تصویرِ پریشانیٔ عالم ہے مری جاں

یہ کیا کہ تجھے بھی ہے زمانے سے شکایت
یہ کیا کہ تری آنکھ بھی پُرنم ہے مری جاں

ہم سادہ دلوں پر یہ شبِ غم کا تسلّط
مایوس نہ ہو اور کوئی دم ہے مری جاں

یہ تیری توجّہ کا ہے اعجاز کہ مجھ سے
ہر شخص ترے شہر کا برہم ہے مری جاں

اے نُزہتِ مہتاب ترا غم ہے مری زیست
اے نازشِ خورشید ترا غم ہے مری جاں

تو رنگ ہے غبار ہیں تیری گلی کے لوگ
تو پھول ہے شرار ہیں تیری گلی کے لوگ

تو رونقِ حیات ہے تو حسنِ کائنات
اُجڑا ہُوا دیار ہیں تیری گلی کے لوگ

تو پیکرِ وفا ہے مجسّم خلوص ہے
بدنامِ روزگار ہیں تیری گلی کے لوگ

روشن ترے جمال سے ہیں مہر و ماہ بھی
لیکن نظر پہ بار ہیں تیری گلی کے لوگ

دیکھو جو غور سے تو زمیں سے بھی پست ہیں
یُوں آسماں شکار ہیں تیری گلی کے لوگ

پھر جا رہا ہُوں تیرے تبسّم کو لُوٹ کر
ہر چند ہوشیار ہیں تیری گلی کے لوگ

کھو جائیں گے سحر کے اُجالوں میں آخرش
شمعِ سرِ مزار ہیں تیری گلی کے لوگ

○

یہ اُجڑے باغ ویرانے پُرانے
سناتے ہیں کچھ افسانے پُرانے
اِک آہِ سرد بن کر رہ گئے ہیں
وہ بیتے دن وہ یارانے پُرانے
جنوں کا ایک ہی عالم ہو کیونکر
نئی ہے شمع پروانے پُرانے
نئی منزل کی دشواری مسلّم
مگر ہم بھی ہیں دیوانے پُرانے
ملے گا پیار غیروں ہی سے جالبؔ
کہ اپنے تو ہیں بیگانے پُرانے

○

شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں
زندگی ڈھل گئی مشینوں میں

پیار کی روشنی نہیں ملتی
ان مکانوں میں ان مکینوں میں

دیکھ کر دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ
سانپ ہوتے ہیں آستینوں میں

قہر کی آنکھ سے نہ دیکھ ان کو
دل دھڑکتے ہیں آبگینوں میں

آسمانوں کی خیر ہو یارب
اک نیا عزم ہے زمینوں میں

وہ محبت نہیں رہی جالبؔ
ہم سفیروں میں ہم نشینوں میں

○

اس نے جب ہنس کے نمسکار کیا
مجھ کو انسان سے اوتار کیا

دشتِ غربت میں دلِ ویراں نے
یادِ جمنا کو کئی بار کیا

پیار کی بات نہ پوچھو یارو!
ہم نے کس کس سے نہیں پیار کیا

کتنی خوابیدہ تمنّاؤں کو
اس کی آواز نے بیدار کیا

ہم پجاری ہیں بتوں کے جالب
ہم نے کعبے میں بھی اقرار کیا

ماورائے جہاں سے آئے ہیں
آج ہم میکدے سے آئے ہیں

اس قدر بے رُخی سے بات نہ کر
دیکھ تو ہم کہاں سے آئے ہیں

ہم سے پُوچھو چمن پہ کیا گزری
ہم گزر کر خزاں سے آئے ہیں

راستے کھو گئے ضیاؤں میں
یہ ستارے کہاں سے آئے ہیں

اس قدر تو بُرا نہیں جالب
مِل کے ہم اس جواں سے آئے ہیں

○

عشق میں نام کر گئے ہوں گے
جو ترے غم میں مر گئے ہوں گے

اب وہ نظریں اِدھر نہیں اٹھتیں
ہم نظر سے اُتر گئے ہوں گے

کچھ فضاؤں میں انتشار سا ہے
ان کے گیسو بکھر گئے ہوں گے

نُور بکھرا ہے رہ گزاروں میں
وہ اِدھر سے گزر گئے ہوں گے

میکدے میں کہ بزمِ جاناں تک
اور جالب کدھر گئے ہوں گے

○

آج پھر تم نظر نہیں آئے
پھر تمنّا کے پھول مرجھائے
آج پھر سوگوار آنکھوں نے
لالہ و گل پہ اشک برسائے
آج پھر عہدِ غم کے افسانے
میری بے تابیوں نے دہرائے
اس بھرے شہر میں تمہارا پتہ
کس کو معلوم کون بتلائے
کن دیاروں میں کھو گئے ہو تم
ہم ستاروں کی خاک چھان آئے

○

کون بتائے کون سجھائے کون سے دیس سدھار گئے
ان کا رستہ تکتے تکتے نین ہمارے ہار گئے

کانٹوں کے دُکھ سہنے میں تسکین بھی تھی آرام بھی تھا
ہنسنے والے بھولے بھالے پھول چمن کے مار گئے

ایک لگن کی بات ہے جیون ایک لگن ہی جیون ہے
پوچھ نہ کیا کھویا کیا پایا کیا جیتے کیا ہار گئے

آنے والی برکھا دیکھیں کیا دکھلائے آنکھوں کو
یہ برکھا برسائے دن تو بن پریتم بیکار گئے

جب بھی لوٹے پیاسے لوٹے پھول ہزار کھلے گلشن میں
بھونرے امرت رس کی دھن میں پل پل سو سو بار گئے

ہم سے پوچھو ساحل والو کیا بیتی دکھیاروں پر
کھیون ہارے بیچ بھنور میں چھوڑ کے جب اس پار گئے

○

پھول سے ہونٹ چاند سا ماتھا
ہم نے بھی ایک خواب دیکھا تھا

کوئی بات ان لبوں تک آئی تھی
کوئی غنچہ ضرور چٹکا تھا

ہائے ڈچکوٹ کی مدھر گلیاں
میں کبھی اس طرف سے گزرا تھا

رات صحنِ خیال میں جالبؔ
اک عجب شوخ رقص فرما تھا

○

نظر نظر میں لیے تیرا پیار پھرتے ہیں

مثالِ موجِ نسیمِ بہار پھرتے ہیں

ترے دیار سے ذرّوں نے روشنی پائی

ترے دیار سے ہم سوگوار پھرتے ہیں

یہ حادثہ بھی عجب ہے کہ تیرے دیوانے

لگائے دل سے غمِ روزگار پھرتے ہیں

لپیٹے ہوئے ہیں دو عالم کا درد سینوں میں

تری گلی میں جو دیوانہ وار پھرتے ہیں

بہار آکے چلی بھی گئی مگر جالب

ابھی نگاہ میں وہ لالہ زار پھرتے ہیں

O

پھول کو دیکھنے سے ایک نظر
کتنے عالم گزر گئے دل پر

یُوں کبھی بے حِسِیاں نہیں جاتیں
ہم نے دیکھا خموش بھی رہ کر

شب کی تاریکیوں میں تیرا خیال
جیسے کھو جائے روشنی میں نظر

تیری بدلی ہُوئی نظر توبہ
کتنا گہرا ہے زندگی پہ اثر

اس دیارِ ستم ظریفاں میں
فرصتِ یاد ہو بہت ہے مگر

قہقہے بے شعور لوگوں کے
کِس قدر بار ہیں سماعت پر

○

شوقِ آوارگی میں کیا نہ ہُوا
ایک تیرا ہی سامنا نہ ہُوا

حرفِ مطلب نہ آ سکا لب پر
مطمئن ہیں کوئی خفا نہ ہُوا

اس کے آنچل کو چھُو رہی ہے صبا
وائے قسمت کہ میں صبا نہ ہُوا

دل میں نوحہ کناں رہا اک غم
گھر کبھی اپنا بے صدا نہ ہُوا

ناخُدا تو ہمیں ڈبو دیتا
خیر گزری کہ وہ خُدا نہ ہُوا

ہم پہ اس عہدِ کم نگاہی میں
کون سا جورِ ناروا نہ ہُوا

اب تو ہم خاک ہو چکے جالب
اب ہمارا کوئی ہُوا نہ ہُوا

○

اس گلی کے لوگوں کو منہ لگا کے پچھتائے
ایک درد کی خاطر کتنے درد اپنائے

تھک کے سو گیا سورج شام کے دھندلکوں میں
آج بھی کئی غنچے پھول بن کے مرجھائے

ہم ہنسے تو آنکھوں میں تیرنے لگی شبنم
تم ہنسے تو گلشن نے تم پہ پھول برسائے

اس گلی میں کیا کھویا اس گلی میں کیا پایا
تشنہ کام پہنچے تھے تشنہ کام لوٹ آئے

پھر رہی ہیں آنکھوں میں تیرے شہر کی گلیاں
ڈوبتا ہوا سورج پھیلتے ہوئے سائے

جالبؔ ایک آوارہ الجھنوں کا گہوارہ
کون اس کو سمجھائے کون اس کو سلجھائے

حسرت رہی کوئی تو یہاں دیدہ ور ملے
لیکن تیری گلی میں سبھی کم نظر ملے

ایسے بھی آشنا ہیں نہ دیکھا جنہیں کبھی
نا آشنا تھے وہ بھی جو شام و سحر ملے

شاید اسی لیے ہمیں منزل نہ مل سکی
جتنے بھی ہم کو لوگ ملے راہبر ملے

لکھی تھیں جن پہ اپنے جنوں کی حکایتیں
آوارگی میں ایسے بھی کچھ بام و در ملے

کیا کیا نظر میں ہوئی گفتگو، نہ پوچھ
مدت کے بعد جب وہ سرِ رہ گزر ملے

ہم کو تو داغِ دل کے سوا کچھ نہ مل سکا
ان بستیوں میں پیار کسی کو مگر ملے

جالبؔ ہوائے لعل و گہر تھی نہ آج ہے
وہ سنگ دل عزیز ہے وہ سنگ در ملے

O

اس کوئے ملامت ہی پہ موقوف نہیں ہے

ہر شہر میں آوارہ و بدنام رہے ہم

کس شوق سے بڑھتے رہے ہر شخص کی جانب

ہر شخص سے محروم بہر گام رہے ہم

اک عمر رہے منتظرِ عہدِ بہاراں

اک عمر اسیرِ خلشِ خام رہے ہم

ہم کہہ نہ سکے کھل کے کوئی بات کسی سے

ہر گام پہ لذّتِ کشِ ابہام رہے ہم

کیوں اپنا مقدّر نہ ہوئے عارض و گیسو

اس فکر میں سوزاں سحر و شام رہے ہم

اس پھول کو پانا تو بڑی بات ہے جالب

اس پھول کو چھونے میں بھی ناکام رہے ہم

○

تیری آنکھوں کا عجب طرفہ سماں دیکھا ہے
ایک عالم تری جانب نگراں دیکھا ہے

کتنے انوار سمٹ آئے ہیں ان آنکھوں میں
اِک تبسّم ترے ہونٹوں پہ رواں دیکھا ہے

ہم کو آوارہ و بے کار سمجھنے والو!
تم نے کب اُس بُتِ کافر کو جواں دیکھا ہے

صحنِ گلشن میں کہ انجم کی طرب گاہوں میں
تم کو دیکھا ہے کہیں جانے کہاں دیکھا ہے

وہی آوارہ و دیوانہ و آشفتہ مزاج
ہم نے جا آپ کو سرِ کوئے بتاں دیکھا ہے

جی دیکھا ہے مر دیکھا ہے
ہم نے سب کچھ کر دیکھا ہے

برگِ آوارہ کی صورت
رنگِ خشک و تر دیکھا ہے

ٹھنڈی آہیں بھرنے والو!
ٹھنڈی آہیں بھر دیکھا ہے

تیری زلفوں کا افسانہ
رات کے ہونٹوں پر دیکھا ہے

اپنے دیوانوں کا عالم
تم نے کب آ کر دیکھا ہے

انجم کی خاموش فضا میں
میں نے تمہیں اکثر دیکھا ہے

ہم نے اس بستی میں جالبؔ
جھوٹ کا اونچا سر دیکھا ہے

○

تباہیوں پہ بھی دل کو ذرا ملال نہ تھا
خوشا وہ دَور کہ جب زیست کا خیال نہ تھا

کہاں کہاں مری نظروں کو اِک تلاش نہ تھی
کہاں کہاں مرے ہونٹوں پہ اک سوال نہ تھا

تری نگاہ سے کوئی گلا نہیں اے دوست
تری نگاہ کے قابل ہمارا حال نہ تھا

کہاں گیا وہ زمانہ کہ جب ہمیں جالبؔ
خیالِ دہر نہ تھا فکرِ ماہ و سال نہ تھا

○

اُٹھتا ہُوا چمن سے دُھواں دیکھتے چلو
شاخوں پہ رقصِ برقِ تپاں دیکھتے چلو
لُٹتی ہُوئی متاعِ بیاں دیکھتے چلو
کٹتی ہُوئی وفا کی زباں دیکھتے چلو
ہر سُو فروغِ وہم و گماں دیکھتے چلو
مِٹتا ہُوا یقین کا نشاں دیکھتے چلو
اپنے سے کچھ کہو نہ پرائے سے کچھ کہو
دِل سوز و دل گداز سماں دیکھتے چلو
جلتا ہُوا کسی کا نشیمن سرِ چمن
خاطر پہ ہو ہزار گراں دیکھتے چلو

توہینِ اہلِ حُسن کہ تضحیکِ اہلِ شوق
سب کچھ بجرمِ زیست یہاں دیکھتے چلو

ہر چند ناپسند ہو تحسینِ ناشناس
چُپ چاپ شعریت کا زیاں دیکھتے چلو

اس شہرِ نیرگی میں نگاہِ خموش سے
شب دوستوں کو رقص کناں دیکھتے چلو

○

اب نہ وہ غزل اپنی اب نہ وہ بیاں اپنا
راکھ ہو گیا جل کر ہر حسیں گماں اپنا
وہ چمن جسے ہم نے خونِ دل سے سینچا تھا
اس پہ حق جتاتی ہیں آج بجلیاں اپنا
بجلیوں نے دنیا کو کچھ سکون تو بخشا
ہم بنائے لیتے ہیں اور آشیاں اپنا
کچھ دنوں رہی تو ہے داستانِ دل رنگیں
کچھ دنوں رہا تو ہے کوئی ہم زباں اپنا
اس دیار کی راتیں نغمہ ریز برساتیں
ہر نظر شراب آلود ہر نفس جواں اپنا
منزلوں نہیں ملتا کوئی سایۂ دیوار
کس کے پاس جائیں ہم کون ہے یہاں اپنا
سر زمیں دو آبے کی ہم سے چھن گئی جالب

○

دِل ہے اب پہلو میں یوں سہما ہُوا
جیسے کٹیا میں دِیا جلتا ہُوا
اب نہ تیرا غم نہ تیری جستجو
زندگی میں کون یوں تنہا ہُوا
پھر رہا ہُوں یوں تری گلیوں سے دُور
جیسے کوئی راستہ بھُولا ہُوا

○

درد کی دھوپ ہے خوف کے سائے ہیں
اپنی منزل تھی کیا اور کہاں آئے ہیں
دل تھا پہلے ہی چھلنی غمِ دہر سے
زخم تیری جُدائی کے بھی کھائے ہیں
سب کو فکرِ گریباں ہے اس عہد میں
ایک اہلِ جنوں ہم ہی کہلائے ہیں

○

جاگنے والو تا بہ سحر خاموش رہو
کل کیا ہوگا کس کو خبر خاموش رہو

کس نے سحر کے پاؤں میں زنجیریں ڈالیں
ہو جائے گی رات بسر خاموش رہو

کس نے سُنی ہے اِس بستی میں دل کی بات
کس پہ ہُوا آہوں کا اثر خاموش رہو

شاید چُپ رہنے میں عزّت رہ جائے
چُپ ہی بھلی اے اہلِ نظر خاموش رہو

قدم قدم پہ پہرے ہیں ان راہوں میں
دار و رسن کا ہے یہ نگر خاموش رہو

یُوں بھی کہاں بے تابیٔ دل کم ہوتی ہے
یُوں بھی کہاں آرام، مگر خاموش رہو

شعر کی باتیں ختم ہوئیں اس عالم میں

غالب و یگانہ سے لوگ بھی تھے جب تنہا
ہم سے طے نہ ہو گی کیا منزلِ ادب تنہا

فکرِ انجمن کس کو کیسی انجمن پیارے
اپنا اپنا غم سب کو سوچیے تو سب تنہا

سن رکھو زمانے کی کل زبان پر ہو گی
ہم جو بات کرتے ہیں آج زیرِ لب تنہا

اپنی رہنمائی میں کی ہے زندگی ہم نے
ساتھ کون تھا پہلے ہو گئے جو اب تنہا

مہر و ماہ کی صورت مسکرا کے گزرے ہیں
خاکدانِ تیرہ سے ہم بھی روز و شب تنہا

کتنے لوگ آ بیٹھے پاس مہرباں ہو کر
ہم نے خود کو پایا ہے تھوڑی دیر جب تنہا

یاد بھی ہے ساتھ ان کی اور غمِ زمانہ بھی
زندگی میں اے جالبؔ ہم رہے ہیں کب تنہا

○

اپنوں نے وہ رنج دئیے ہیں بیگانے یاد آتے ہیں
دیکھ کے اس بستی کی حالت بیگانے یاد آتے ہیں

اس نگری میں قدم قدم پہ سر کو جھکانا پڑتا ہے
اس نگری میں قدم قدم پر بُت خانے یاد آتے ہیں

آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں غربت کے صحراؤں میں
جب اُس رِم جِھم کی وادی کے افسانے یاد آتے ہیں

ایسے ایسے درد ملے ہیں نئے دیاروں میں ہم کو
بچھڑے ہُوئے کچھ لوگ پُرانے یارانے یاد آتے ہیں

جن کے کارن آج ہمارے حال پہ دنیا ہنستی ہے
کتنے ظالم چہرے جانے پہچانے یاد آتے ہیں

یُوں نہ لُٹی تھی گلیوں گلیوں دولت اپنے اشکوں کی
روتے ہیں تو ہم کو اپنے غم خانے یاد آتے ہیں

کوئی تو پرچم لے کر نکلے اپنے گریباں کا جالبؔ
چاروں جانب سنّاٹا ہے دیوانے یاد آتے ہیں

○

نہ ڈگمگائے کبھی ہم وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

کسے لگائے گلے اور کہاں کہاں ٹھہرے
ہزار غنچہ و گل ہیں صبا کے رستے میں

خدا کا نام کوئی لے تو چونک اُٹھتے ہیں
ملے ہیں ہم کو وہ رہبر خدا کے رستے میں

کہیں سلاسلِ تسبیح اور کہیں زنّار
بچھے ہیں دام بہت مدّعا کے رستے میں

ابھی وہ منزلِ فکر و نظر کہاں آئی
ہے آدمی ابھی جرم و سزا کے رستے میں

ہیں آج بھی وہی دار و رسن، وہی زنداں
ہر اک نگاہِ رموز آشنا کے رستے میں
یہ نفرتوں کی فصیلیں، جہالتوں کے حصار
نہ رہ سکیں گے ہماری صدا کے رستے میں
مٹا سکے نہ کوئی سیلِ انقلاب جنہیں
وہ نقش چھوڑے ہیں ہم نے وفا کے رستے میں
زمانہ ایک سا جالبؔ سدا نہیں رہتا
چلیں گے ہم بھی کبھی سر اٹھا کے رستے میں

ویراں ہے میری شام، پریشاں مری سحر
اچھا ہُوا کہ تم نہ ہوئے میرے ہم سفر

کوئی صدا نہیں کہ جسے زندگی کہوں
مُدّت سے ہے خموش مرے دل کی رہگذر

لو اب تو شورِ نالہ و فریاد ختم گیا
میرے جنوں پہ ایک زمانے کی تھی نظر

اے میرے ماہتاب کہاں چُھپ گیا ہے تُو
تُجھ بن بُجھے بُجھے ہیں محبّت کے بام و در

تیرے بغیر کتنی فسردہ ہے بزمِ شعر
اے دوست اب پڑھوں میں غزل کس کو دیکھ کر

میں تیری بے رُخی کو بھی سمجھوں گا التفات
پیارے مرے قریب سے اک بار پھر گزر

جاگب مجھے تو اُن کے گریباں کی فکر ہے
جو ہنس رہے ہیں میرے گریباں کے چاک پر

○

جس کی آنکھیں غزل ہر ادا شعر ہے

وہ مری شاعری ہے مرا شعر ہے

وہ حسیں زُلف شب کا فسانہ لیے

وہ بدن نغمگی وہ قبا شعر ہے

وہ تکلّم لہکتی ہُوئی چاندنی

وہ تبسّم مہکتا ہُوا شعر ہے

پھُول بھی ہیں بہاریں بھی ہیں گیت بھی

ہم نشیں اس گلی کی فضا شعر ہے

جس سے روشن تھا دل وہ کرن چھِن گئی

اپنے جینے کا اب آسرا شعر ہے

اپنے انداز میں بات اپنی کہو
میرؔ کا شعر تو میرؔ کا شعر ہے

میں جہانِ ادب میں اکیلا نہیں
ہر قدم پر مرا ہم نوا شعر ہے

عرش پر خود کو محسوس ہم نے کیا
جب کسی نے کہا واہ کیا شعر ہے

اِک قیامت ہے جالبؔ یہ تنقیدِ نو
جو سمجھ میں نہ آئے بڑا شعر ہے

O

جیون مجھ سے میں جیون سے شرماتا ہوں
مجھ سے آگے جانے والو میں آتا ہوں

جن کی یادوں سے روشن ہیں میری آنکھیں
دل کہتا ہے اُن کو بھی میں یاد آتا ہوں

سُر سے سانسوں کا ناتا ہے توڑوں کیسے
تم جلتے ہو کیوں جیتا ہوں کیوں گاتا ہوں

تم اپنے دامن میں ستارے بیٹھ کے ٹانکو
اور میں نئے برن لفظوں کو پہناتا ہوں

جن خوابوں کو دیکھ کے میں نے جینا سیکھا
اُن کے آگے ہر دولت کو ٹھکراتا ہوں

زہر اُگلتے ہیں جب مل کر دُنیا والے
میٹھے بولوں کی وادی میں کھو جاتا ہوں

جالبؔ میرے شعر سمجھ میں آجاتے ہیں
اسی لیے کم رُتبہ شاعر کہلاتا ہوں

ہم کو نظروں سے گرانے والے
ڈھونڈ اب ناز اٹھانے والے

چھوڑ جائیں گے کچھ ایسی یادیں
روئیں گے ہم کو زمانے والے

رہ گئے نقش ہمارے باقی
مِٹ گئے ہم کو مٹانے والے

منزلِ گُل کا پتا دیتے ہیں
راہ میں خار بچھانے والے

ان زمینوں پہ گھِر برسیں گے
ایسے کچھ ابر ہیں چھانے والے

دیکھ وہ صُبح کا سُورج نکلا
مُسکرا اشک بہانے والے

آس میں بیٹھے ہیں جن کی جالبؔ
وہ زمانے بھی ہیں آنے والے

○

ناشناسوں کی محفل میں اے نغمہ گر!
فن کو رُسوا نہ کر، فن کو رُسوا نہ کر
کون اس انجمن میں ہے اہلِ نظر
دولتِ رائگاں ہے متاعِ ہُنر
کتنے بے نُور ہیں آفتاب و قمر
گردشِ روز و شب آ گئے ہم کدھر
کتنی ویران ہیں پیار کی بستیاں
نوحہ گر ہے وفا رہگزر رہگزر
جہل مسند نشیں ہے بصد تمکنت
ہمنشیں کیوں نہ ہو علم کی آنکھ تر

شیخ کی آنکھ میں بھی مروّت نہیں
برہمن بھی محبّت سے ہے بے خبر

میں بھی منصُور ہُوں میں بھی منصور ہُوں
کاٹ دو میرا سر، کاٹ دو میرا سر

دِل میں روشن ہے ابتک تری آرزو
اے دیارِ سحر، اے دیارِ سحر

○

یہ زندگی گزار رہے ہیں جو ہم یہاں
یہ زندگی نصیب ہے لوگوں کو کم یہاں

کوشش کے باوجود بھلائے نہ جائیں گے
ہم پر جو دوستوں نے کئے ہیں کرم یہاں

کہنے کو ہمسفر ہیں بہت اس دیار میں
چلتا نہیں ہے ساتھ کوئی دو قدم یہاں

دیوارِ یار ہو کہ شبستانِ شہریار
دو پل کو بھی کسی کے نہ سائے میں تھم یہاں

ان بستیوں میں رسمِ وفا ختم ہو چکی
اے چشمِ نم کسی سے نہ کر عرضِ غم یہاں

صد حیف جن کے دم سے پریشان ہے آدمی
سب کی نگاہ میں ہیں وُہی محترم یہاں

نظمیں اُداس اُداس فسانے بجھے بجھے
مُدّت سے اشکبار رہیں لوح و قلم یہاں

اے ہم نفس یہی تو ہمارا قصور ہے
کرتے ہیں دھڑکنوں کے فسانے رقم یہاں

○

آج ہمارے حال پہ ہنس لو شہر کے عزّت دارو
کل کو تمہارے حال پہ ہم کو اشک بہانے ہوں گے

ابھی کہاں تکمیل ہوئی ہے اپنے جنوں کی پیارے
اور ابھی لڑکوں کے ہاتھوں پتّھر کھانے ہوں گے

اور ابھی توہینِ محبّت قدم قدم پر ہوگی
اور ابھی بےدرد جہاں کے ناز اٹھانے ہوں گے

تم تو کسی کو بھولے سے بھی یاد نہیں آؤ گے
آنے والے عہد کے لب پر اپنے فسانے ہوں گے

تم نے بھی تو محفل میں سب راز کی باتیں کہہ دیں
شہر میں جالبؔ تم سے بھی کم ہی دیوانے ہوں گے

تِرے ماتھے پہ جب تک بل رہا ہے
اُجالا آنکھ سے اوجھل رہا ہے

سماتے کیا نظر میں چاند تارے
تصوّر میں ترا آنچل رہا ہے

تری شانِ تغافل کو خبر کیا
کوئی تیرے لیے بیکل رہا ہے

شکایت ہے غمِ دوراں کو مجھ سے
کہ دل میں کیوں ترا غم پل رہا ہے

تعجّب ہے سِتم کی آندھیوں میں
چراغِ دل ابھی تک جل رہا ہے

لہو روئیں گی مغرب کی فضائیں
بڑی تیزی سے سُورج ڈھل رہا ہے

زمانہ تھک گیا، جالبؔ ہی تنہا
وفا کے راستے پر چل رہا ہے

○

کہیں آہ بن کے لب پر ترا نام آ نہ جائے
تجھے بے وفا کہوں میں، وہ مقام آ نہ جائے

ذرا زلف کو سنبھالو مرا دل دھڑک رہا ہے
کوئی اور طائرِ دل تہہِ دام آ نہ جائے

جسے سن کے ٹوٹ جائے مرا آرزو بھرا دل
تری انجمن سے مجھ کو وہ پیام آ نہ جائے

وہ جو منزلوں پہ لاکر کسی ہمسفر کو لوٹیں
انہی رہزنوں میں تیرا کہیں نام آ نہ جائے

اسی فکر میں ہیں غلطاں یہ نظامِ زر کے بندے
جو تمام زندگی ہے وہ نظام آ نہ جائے

یہ مہ و نجوم ہنس لیں مرے آنسوؤں پہ جالب
مرا ماہتاب جب تک لبِ بام آ نہ جائے

○

کیسی ہوا گلشن میں چلی
مُرجھائی ایک ایک کلی
دل کی کہانی کیا کہیے
اپنی ہی آگ میں شمع جلی
اُس لٹ کا اُلجھاؤ گیا
ایک بلا تو سر سے ٹلی
دُنیا نے وہ درد دیے
بُھول گئے ہم ان کی گلی
بول کے جالب قدر نہ کھو
اس ماحول میں چُپ ہی بھلی

○

نہ وہ ادائے تکلّم نہ احتیاطِ زباں
مگر یہ ضد کہ ہمیں اہلِ لکھنؤ کہیے

نہ دل میں رقصِ غزل ہے نہ دھڑکنوں کے گیت
اُجڑ گیا ہے، جسے شہرِ آرزو کہیے

کہاں اب اُن کو پکاریں، کہاں گئے وہ لوگ
جنہیں فسونِ طرب موجِ رنگ و بُو کہیے

غزل کی بات جو کرتا ہے کم نظر نقّاد
اِسے بھی شیخ کا اندازِ گفتگو کہیے

ادب کا آپ ہی تنہا نہ ساتھ دیں جالبؔ
کہے جو آپ کو 'تم'، آپ اس کو 'تو' کہیے

بُھلا بھی دے اُسے جو بات ہو گئی پیارے
نئے چراغ جلا رات ہو گئی پیارے

تری نگاہِ پشیماں کو کیسے دیکھوں گا
کبھی جو تجھ سے ملاقات ہو گئی پیارے

نہ تیری یاد، نہ دُنیا کا غم، نہ اپنا خیال
عجیب صورتِ حالات ہو گئی پیارے

اُداس اُداس ہیں شمعیں بُجھے بُجھے ساغر
یہ کیسی شامِ خرابات ہو گئی پیارے

کبھی کبھی تیری یادوں کی سانولی رُت میں
بہے جو اشک تو برسات ہو گئی پیارے

وفا کا نام نہ لے گا کوئی زمانے میں
ہم اہلِ دل کو اگر مات ہو گئی پیارے

تمہیں تو ناز بہت دوستوں پہ تھا جالبؔ
الگ تھلگ سے ہو کیا بات ہو گئی پیارے

○

درخت سُوکھ گئے رُک گئے ندی نالے

یہ کِس نگر کو روانہ ہوئے گھروں والے

کہانیاں جو سُناتے تھے عہدِ رفتہ کی

نشاں وہ گردشِ ایّام نے مِٹا ڈالے

مَیں شہر شہر پِھرا ہُوں اِسی تمنّا میں

کِسی کو اپنا کہوں کوئی مجھ کو اپنا لے

صدا نہ دے کسی مہتاب کو اندھیروں میں

لگا نہ دے یہ زمانہ زبان پر تالے

کوئی کِرن ہے یہاں تو کوئی کِرن ہے وہاں

دل و نِگاہ نے کِس درجہ روگ ہیں پالے

ہمیں پہ ان کی نظر ہے ہمیں پہ ان کا کرم

یہ اور بات یہاں اور بھی ہیں دل والے

کچھ اور تجھ پہ کُھلیں گی حقیقتیں جالب

جو ہو سکے تو کسی کا فریب بھی کھا لے

○

بڑھائیں گے نہ کبھی ربط ہم بہاروں سے
ٹپک رہا ہے لہو اب بھی شاخساروں سے
کہیں تو اپنی محبّت پہ حرف آتا ہے
کچھ ایسے داغ بھی ہم کو ملے ہیں یاروں سے
نگاہِ دہر میں ذرّے سہی مگر ہم لوگ
ضیا کی بھیک نہیں مانگتے ستاروں سے
وہ داستاں ہیں کہ دہرائے گی جسے دُنیا
وہ بات ہے جو سُنی جائے گی نگاروں سے
ہمارے نام سے ہے آشنا چمن سارا
سُخن کی داد ملی ہے ہمیں ہزاروں سے

فضا نہیں ہے ابھی کھُل کے بات کہنے کی
بدل رہے ہیں زمانے کو ہم اشاروں سے
نہ چھوڑنا کبھی طوفاں میں آس کی پتوار
یہ آ رہی ہے صدا دم بدم کناروں سے
جہاں میں آج بھی محفوظ ہیں وہی نغمے
محبتوں میں جو اُبھرے ہیں دل کے تاروں سے
بزرگ بیٹھ کے لکھتے تھے عرش پر جالبؔ
اُٹھائی بات مگر ہم نے رہگزاروں سے

غزلیں تو کہی ہیں کچھ ہم نے اُن سے نہ کہا احوال تو کیا
کل مثلِ ستارہ اُبھریں گے ہیں آج اگر پامال تو کیا

جینے کی دعا دینے والے یہ راز تجھے معلوم کہاں
تخلیق کا اِک لمحہ ہے بہت، بیکار جیئے سو سال تو کیا

سِکّوں کے عوض جو بِک جائے وہ میری نظر میں حُسن نہیں
اے شمعِ شبستانِ دولت! تُو ہے جو پری تمثال تو کیا

ہر پھُول کے لب پر نام مرا، چرچا ہے چمن میں عام مرا
شہرت کی یہ دولت کیا کم ہے گر پاس نہیں ہے مال تو کیا

ہم نے جو کیا محسوس کہا جو درد ملا ہنس ہنس کے سہا
بھُولے گا نہ مستقبل ہم کو نالاں ہے جو ہم سے حال تو کیا

ہم اہلِ محبّت پا لیں گے اپنے ہی سہارے منزل کو
یارانِ سیاست نے ہر سُو پھیلائے ہیں رنگیں جال تو کیا

دنیائے ادب میں اے جالبؔ اپنی بھی کوئی پہچان تو ہو
اقبال کا رنگ اڑانے سے تو بن بھی گیا اقبال تو کیا

شہرِ دہلی

دیارِ داغؔ و بیخودؔ شہرِ دہلی چھوڑ کر تجھ کو
نہ تھا معلوم یُوں روئے گا دِل شام و سحر تجھ کو
کہاں ملتے ہیں دنیا کو کہاں ملتے ہیں دُنیا میں
ہوئے تھے جو عطا اہلِ سخن اہلِ نظر تجھ کو
تجھے مرکز کہا جاتا تھا دُنیا کی نگاہوں کا
محبّت کی نظر سے دیکھتے تھے سب نگر تجھ کو
بقولِ میرؔ اوراقِ مصوّر تھے ترے کُوچے
مگر ہائے زمانے کی لگی کیسی نظر تجھ کو
نہ بھُولے گا ہماری داستاں تو بھی قیامت تک
دلائیں گے ہماری یاد تیرے رہ گزر تجھ کو

جو تیرے غم میں بہتا ہے وہ آنسو رشکِ گوہر ہے
سمجھتے ہیں متاعِ دیدہ و دل دیدہ ور تجھ کو

مَیں جالبؔ دہلوی کہلا نہیں سکتا زمانے میں
مگر سمجھا ہے مَیں نے آجتک اپنا ہی گھر تجھ کو

لائل پور

لائل پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد
دھڑکن دھڑکن ساتھ رہے گی اس بستی کی یاد
میٹھے بولوں کی وہ نگری گیتوں کا سنسار
ہنستے بستے ہائے وہ رستے نغمہ ریزہ یار
وہ گلیاں وہ پھول وہ کلیاں رنگ بھرے بازار
میں نے ان گلیوں پھولوں کلیوں سے کیا ہے پیار
برگِ آوارہ میں بکھری ہے جس کی روداد
لائل پور اک شہر ہے جس میں دل ہے مرا آباد
کوئی نہیں تھا کام مجھے پھر بھی تھا کتنا کام
ان گلیوں میں پھرتے رہنا دن کو کرنا شام

گھر گھر میرے شعر کے چرچے گھر گھر میں بدنام
راتوں کو دہلیزوں ہی پر کر لینا آرام
دُکھ سہنے میں چُپ رہنے میں دل تھا کتنا شاد
لائل پُور اک شہر ہے جس میں دل ہے مِرا آباد
مَیں نے اس نگری میں رہ کر کیا کیا لکھے گیت
جن کے کارن لوگوں کے من میں ہے میری پریت
ایک لگن کی بات ہے جیون کیسی ہار اور جیت
سب سے مجھ کو پیار ہے جالبؔ سب ہیں میرے میت
داد تو ان کی یاد ہے مجھ کو بھُول گیا بے داد
لائل پُور اک شہر ہے جس میں دل ہے مِرا آباد

متاعِ غیر

آخر کار یہ ساعت بھی قریب آ پہنچی
تو مری جان کسی اور کی ہو جائے گی
کل تلک میرا مقدّر تھی تری زلف کی شام
کیا تغیّر ہے کہ اب غیر کی کہلائے گی
میرے غم خانے میں تو اب نہ کبھی آئے گی

تیری سہمی ہوئی معصوم نگاہوں کی زباں
میری محبوب کوئی اجنبی کیا سمجھے گا
کچھ جو سمجھا بھی تو اس عیشِ خوشی کے ہنگام
تیری خاموش نگاہی کو حیا سمجھے گا
تیرے بہتے ہوئے اشکوں کو ادا سمجھے گا

میری دم ساز زمانے سے چلی آتی ہیں
رہنِ غم وقفِ الم سادہ دلوں کی آنکھیں
یہ نیا ظلم ہے نہیں پیار کے متوالوں پر
ہم نے دیکھیں یونہی نم سادہ دلوں کی آنکھیں
اور رولیں کوئی دم سادہ دلوں کی آنکھیں

رخصتی

تو کلی نزہتوں نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گل سوئے صحرا چلی

وہ سلگتا دِیا تو سحر کی کرن
سوچتا ہوں یہی کیسے بہلے گا من

وہ تڑپ کنول کو سکوں کیسے بخشے گا وطن
لوگ تجھ کو کہیں گے نصیبوں جلی

تو کلی نزہتوں نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گل سوئے صحرا چلی

تو جہاں سے گزرتی تھی شام و سحر
اب کہاں کہکشاں وہ حسیں رہگزر

شامِ غم چھائی ہے دیکھتا ہوں جدھر
کتنی ویران ہے آج تیری گلی

تو کلی نزہتوں نکہتوں میں پلی
چھوڑ کر شہرِ گل سوئے صحرا چلی

رخصتی کا گیت

جب تو جائے گی گھر اپنے
یاد آئیں گے سندر سپنے
دھڑکن لگ جائے گی بچپنے
بیتی برساتوں کی مالا
جادوگر راتوں کی مالا

بیٹھے بیٹھے کھو جائے گی
خاموشی کے صحراؤں میں
اِک ہلچل سی مچ جائے گی
سہمی سہمی آشاؤں میں

ناتھ آئیں گے پیار جتانے
رُوٹھی ہوئی رادھا کو منانے
دِل کا درد کوئی کیا جانے

سونے کی دُنیا میں رہ کر
پیلی پیلی ہو جائے گی
بھیگی بھیگی سی آنکھوں میں
پَل چھن سرسوں لہرائے گی

پیڑوں کی وہ ٹھنڈی چھاؤں
سُندر سکھیاں پنگھٹ گاؤں
چھن چھن پائل ننگے پاؤں

حسبِ فرمائش

میں تجھے پھول کہوں اور کہوں بھونروں سے
"آؤ اس پھول کا رس چوس کے ناچو جھومو"
میں تجھے شمع کہوں اور کہوں "پروانو!
آؤ اس شمع کے ہونٹوں کو خوشی سے چومو"

میں تری آنکھ کو تشبیہہ دوں میخانے سے
اور خود زہرِ جدائی کا طلب گار رہوں
غیر سوئے تری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں
اور میں چاندنی راتوں میں فقط شعر کہوں

مجھ سے یہ تیرے قصیدے نہ لکھے جائیں گے
مجھ سے تیرے لیے غزلیں نہ کہی جائیں گی
یاد میں تیری میں سلگا نہ سکوں گا آنکھیں
سختیاں درد کی مجھ سے نہ سہی جائیں گی

شہر میں ایسے مصوّر ہیں جو سکّوں کے عوض
حسن میں لیلیٰ و عذرا سے بڑھا دیں گے تجھے
طول دے کر تیری زلفوں کو شبِ غم کی طرح
فن کے اعجاز سے ناگن سی بنا دیں گے تجھے!

تجھ کو شہرت کی ضرورت ہے محبّت کی مجھے
اے حسینہ تری منزل تری منزل میں نہیں
ناچ گھر تیری نگاہوں میں ہیں رقصاں لیکن
اس تعیّش کی تمنّائیں مرے دِل میں نہیں

دیکھ کر غیر کے پہلو میں تجھے رقص کناں
بھیگ جاتی ہے مری آنکھ سرشکِ غم سے
مجھ کو برسوں کی غلامی کا خیال آتا ہے
جس نے اندازِ وفا چھین لیا ہے ہم سے

مجھ کو بھونرا نہ سمجھ مجھ کو پتنگا نہ سمجھ
مجھ کو انسان سمجھ میری صداقت سے نہ کھیل
تیری تفریح کا ساماں نہ بنوں گا ہرگز
میری دُنیا ہے یہی میری محبّت سے نہ کھیل

مشاعرہ

ابھی جو پاس سے گزری ہے خاک اُڑاتی ہوئی
یہی وہ کار تھی جس میں وہ لوگ آئے تھے

حضور آپ ہی جانب ہیں، آپ کی خاطر
تمام شہر میں دیوانہ وار گھومے ہیں،

کسی طرح سے کہیں آپ کا سُراغ ملے
حضور ہم نے بگولوں کے پاؤں چومے ہیں

ابھی جو پاس سے گزری ہے خاک اُڑاتی ہوئی
مشاعرے میں اسی کار سے گیا تھا میں

ہم دیکھتے ہیں

۱۲ رجون ۱۹۵۸ء کو لاہور میں نابیناؤں کی امدادی انجمن کے مشاعرے میں پڑھی گئی!

وہی عالم ہے جو تم دیکھتے ہو
نہیں کچھ مختلف عالم ہمارا
جلائے ہم نے پلکوں پر دیے بھی
نہ چمکا پھر بھی قسمت کا ستارا
نظر میں ہے وقت کا بے نور دھارا

وہی سر پر مسلّط ہے شبِ غم
اندھیرے ہر طرف چھائے ہوئے ہیں
نہیں ملتی خوشی کی اِک کرن بھی
مہ و خورشید گہنائے ہوئے ہیں
یہ کس بستی میں ہم آئے ہوئے ہیں

شکایت ہے تمہیں آنکھوں سے اپنی
یہاں آنکھیں کہاں روشن رفیقو
کلی کی آنکھ نم، روتی ہے شبنم!
سُلگتے ہیں گُلوں کے تن رفیقو!
نظر آتے ہیں گلشن بن رفیقو!

جنہیں ہم شعر میں کہتے ہیں جادُو
ان آنکھوں کو یہاں نم دیکھتے ہیں
لبوں پہ آہ اور زلفیں پریشاں
غزل کو وقفِ ماتم دیکھتے ہیں
ستم کیا کم ہے یہ ہم دیکھتے ہیں

احمد ریاض کی یاد میں

پہلے ہی اپنا کون تھا اے دوست
اب جو تو ہو گیا جُدا اے دوست

ساتھ کس نے دیا کسی کا یہاں
ساری دُنیا ہے بیوفا اے دوست

تو جلا شمع کی طرح سرِ بزم
نُور تھا تیرا ہم نوا اے دوست

کتنی خوش بخت ہے زمیں وہ بھی
اب جو دے گی ترا پتا اے دوست

یہ زمانا ہے شعر کا دشمن
اس زمانے کا کیا گلا اے دوست

صبح آئے گی لے کے وہ خورشید
جس پہ تو ہو گیا فدا اے دوست

شہرِ ظُلمات کو ثبات نہیں

اے نظامِ کہن کے فرزندو
اے شبِ تار کے جگر بندو

یہ شبِ تار جاوداں تو نہیں
یہ شبِ تار جانے والی ہے
تابکے تیرگی کے افسانے
صُبحِ نو مُسکرانے والی ہے

اے شبِ تار کے جگر گوشو
اے سحر دُشمنو ستم کوشو

صُبح کا آفتاب چمکے گا
ٹوٹ جائے گا جہل کا جادُو
پھیل جائے گی ان دیاروں میں
علم و دانش کی روشنی ہر سُو

اے شبِ تار کے نگہبانو
شمعِ عہدِ زیاں کے پروانو
شہرِ ظلمات کے ثنا خوانو
شہرِ ظلمات کو ثبات نہیں
اور کچھ دیر صبح پر ہنس لو
اور کچھ دیر — کوئی بات نہیں

مستقبل

تیرے لیے میں کیا کیا صدمے سہتا ہُوں
سنگینوں کے راج میں بھی سچ کہتا ہُوں
میری راہ میں مصلحتوں کے پھُول بھی ہیں
تیری خاطر کانٹے چُنتا رہتا ہُوں
تُو آئے گا، اِسی آس پر جھُوم رہا ہے دِل
دیکھ اے مستقبل

اِک اِک کر کے سارے ساتھی چھوڑ گئے
مجھ سے میرے رہبر بھی مُنہ موڑ گئے
سوچتا ہُوں بیکار گِلا ہے غیروں کا
اپنے ہی جب پیار کا ناتا توڑ گئے

تیرے بھی دشمن ہیں میرے خوابوں کے قاتل
دیکھ اے مُستقبل

جہل کے آگے سر نہ جھکایا مَیں نے کبھی
سِفلوں کو اپنا نہ بنایا مَیں نے کبھی
دولت اور عہدوں کے بل پر جو اینٹھیں
اُن لوگوں کو مُنہ نہ لگایا مَیں نے کبھی
مَیں نے چور کہا چوروں کو کھل کے سرِ محفل
دیکھ اے مُستقبل

نام کیا لُوں

ایک عورت جو میرے لیے مُدّتوں
شمع کی طرح آنسُو بہاتی رہی
میری خاطر زمانے سے مُنہ موڑ کر
میرے ہی پیار کے گیت گاتی رہی
میرے غم کو مقدّر بنائے ہُوئے
مُسکراتی رہی

اُس کے غم کی کبھی مَیں نے پروا نہ کی
اُس نے ہر حال میں نام میرا لیا
چھین کر اُس کے ہونٹوں کی میں نے ہنسی
تیری دہلیز پر اپنا سر رکھ دیا
تُو نے میری طرح میرا دل توڑ کر
مُجھ پہ احساں کیا

یوری گیگرین

موت کے بیاباں سے زندگی گزر آئی
ظلمتوں کے صحرا میں روشنی نظر آئی

آدمی کی راہوں میں گرد ہیں مہ و انجم
ماورائے امکاں سے ہم کو یہ خبر آئی

صبح و شام لرزاں تھے سامنے نگاہوں کے
اہلِ دل کی منزل میں وہ بھی رہگذر آئی

جب سے دکھ زمانے کے ہمسفر بنائے ہیں
چھب مرے خیالوں کی اور بھی نکھر آئی

○

مری نگاہ سے وہ دیکھتے رہے ہیں مجھے
رہا ہوں میں بھی کبھی اس نگاہ کا معیار

یہاں نہ تلخ نوائی سے کام لو جالب
رہینِ درد نہیں ہیں یہ بستیاں یہ دیار

نہ کلیوں میں رنگت نہ پھولوں میں باس
بہار آئی پہنے خزاں کا لباس

گھنی چھاؤں ہے دو گھڑی بیٹھ لو
کڑی دھوپ میں جاؤ گے کس کے پاس

ستارو یونہی جگمگاتے رہو!
رفیقو کہیں ٹوٹ جائے نہ آس

○

اجنبی دیاروں میں پھر رہے ہیں آوارہ
اے غمِ جہاں تو نے یہ بھی دن دکھائے ہیں
تیرے بام و در سے دور تیرے رہگزر سے دور
رات کی سیاہی ہے تیرگی کے سائے ہیں
اس نگاہ سے جالب رسم و راہ کی خاطر
ہم نے کم نگاہوں کے ناز بھی اٹھائے ہیں

○

اُٹھ گیا ہے دلوں سے پیار یہاں
کتنے بے نور ہیں دیار یہاں
"روشنی روشنی، حیات حیات"
ہر طرف ہے یہی پکار یہاں
راستہ کیا سجھائی دے ایسے
جہل ہے شمعِ رہگزار یہاں

○

اشک آنکھوں میں اب ہیں آئے سے
بات چھپتی نہیں چھپائے سے
اپنی باتیں کہیں تو کس سے کہیں
سب یہاں لوگ ہیں پرائے سے

○

حُسن کا ہم نے کیا چرچا بہت
حُسن کے ہاتھوں ہوئے رُسوا بہت

موجِ نکہت اپنی قسمت میں نہ تھی
دُور سے اُس پھول کو دیکھا بہت

وہ ملا تھا راہ میں اک شام کو
پھر اُسے میں نے یہاں ڈھونڈا بہت

"سرِ مقتل" کی ضبطی پر

مرے ہاتھ میں قلم ہے مرے ذہن میں اُجالا

مجھے کیا دبا سکے گا کوئی ظلمتوں کا پالا

مجھے فکرِ امنِ عالم تجھے اپنی ذات کا غم

میں طلوع ہو رہا ہوں تو غروب ہونے والا

مادرِ ملّت

اب رہیں چین سے بے درد زمانے والے
سو گئے خواب سے لوگوں کو جگانے والے

دیکھنے کو تو ہزاروں ہیں مگر کتنے ہیں
ظلم کے آگے کبھی سر نہ جھکانے والے

مر کے بھی مرتے ہیں کب مادرِ ملّت کی طرح
شمع تاریک فضاؤں میں جلانے والے

سحاب

اے سحاب اے سحاب
اے ردائے آفتاب

آگ ہے برس رہی
جل رہی ہے زندگی
اور دل کی تشنگی

دیکھتی ہے تیرے خواب
اے سحاب اے سحاب

خشک خشک ہے زمیں
دُور تک نمی نہیں
ہر نفس ہے آتشیں

ہر طرف ہے اِک سراب
اے سحاب اے سحاب

یہ نہیں کہ غم نہیں
پھر بھی آنکھ نم نہیں
یہ ستم بھی کم نہیں

آہ بیں نہیں ہے تاب
اے سحاب اے سحاب

اِک خیال کہہ گیا
کتنی دُور رہ گیا
آنسوؤں میں بہہ گیا

ہائے موسمِ شراب
اے سحاب اے سحاب

کافی ہاؤس

دِن بھر کافی ہاؤس میں بیٹھے کچھ دُبلے پتلے نقّاد
بحث یہی کرتے رہتے ہیں سست ادب کی ہے فتار
صرف ادب کے غم میں غلطاں چلنے پھرنے سے لاچار
چہروں سے ظاہر ہوتا ہے جیسے برسوں کے بیمار

اُردو ادب میں ڈھائی ہیں شاعر میرؔ و غالبؔ آدھا جوشؔ
یا اک آدھ کسی کا مصرعہ یا اقبالؔ کے چند اشعار
یا پھر نظم ہے اک چوہے پر حامدؔ مدنی کا شہکار
کوئی نہیں ہے اچھا شاعر کوئی نہیں افسانہ نگار

منٹو کرشن ندیم اور بیدی ان میں جان تو ہے لیکن
عیب یہ ہے ان کے ہاتھوں میں کُند زباں کی ہے تلوار
عالی افسر، انشا بابو، ناصر میر کے برخوردار
فیض نے جو اب تک لکھا ہے، کیا لکھا ہے سب بیکار

ان کو ادب کی صحت کا غم مجھ کو ان کی صحت کا
یہ بیچارے دُکھ کے مارے جینے سے ہیں کیوں بیزار
حُسن سے وحشت عشق سے نفرت اپنی ہی صورت سے پیار
خندۂ گُل پر ایک تبسّم گریۂ شبنم سے انکار

نئی پود

ریستوراں میں بیٹھو اور کانٹے سے کھانا کھاؤ
اُلجھے اُلجھے شعر کہو ذہنوں کو خوب اُلجھاؤ
میرؔ کے مصرعے آگے رکھ کر غزلیں کہتے جاؤ
خود کو پورا، میرؔ کو آدھا ہی شاعر بتلاؤ
اور پھر نئی پود کہلاؤ

ٹیبل پر جو بات کرو بس لکھتے جاؤ یارو!
اور پھر اس کو ماہِ نَو کے ماتھے پر دے مارو
سب تم کو فن کار کہیں تم رُوپ کچھ ایسا دھارو
مکتب کے لڑکوں کو اپنی نظمیں یاد کراؤ
اور پھر نئی پود کہلاؤ

اُلٹی سیدھی باتوں سے محفل پر رُعب جمانا
نقّادوں کو پیسے دے کر خود پر کچھ لکھوانا
اس انداز سے شہرت کی منزل کو سیکھو پانا
موسیقار اگر بننا ہے ہلکا پھُلکا گاؤ
اور پھر نئی پود کہلاؤ

چند لکیریں کھینچو دے دو عورت کا عنوان
گنجا سر بے نور نگاہیں اور سینہ ویران
کسی ہال میں کرو نمائش جاؤ انگلستان
ننگی تصویروں کو جو چاہو معنی پہناؤ
اور پھر نئی پود کہلاؤ

اربابِ ذوق

گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے

دن بھر دفتر کو ٹرخانا

شام کا جب اندھیارا چھایا

محفل میں ساغر چھلکایا

پھول پھول بھونرا لہرایا   رات کے ایک بجے گھر پہنچے

گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے

غالب سے ہے ان کو رغبت

میر سے بھی کرتے ہیں الفت

اور تخلص بھی ہے عظمت

گھر اقبال کے کھانے دعوت   چھوٹی عمر میں اکثر پہنچے

گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے

حلقے میں اتوار منانا
ان کا ہے انداز پرانا
نئی ادائیں نیا زمانا
منٹو کا سننے افسانہ   اکشم پہنے نیکر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے

ناک پہ چشمہ سا اٹکائے
گردن میں ٹائی لٹکائے
انگلش لٹریچر کو کھائے
اردو لٹریچر پڑھائے   کالج دینے لیکچر پہنچے
گھر سے نکلے کار میں بیٹھے کار سے نکلے دفتر پہنچے

روئے بھگت کبیر

پُوچھ نہ کیا لاہور میں دیکھا ہم نے یہاں نظیرؔ
پہنیں سُوٹ انگریزی بولیں اور کہلائیں میر
چودھریوں کی مٹھی میں ہے شاعر کی تقدیر
روئے بھگت کبیر

ایک دُوجے کو جاہل سمجھیں نٹ کھٹ بدھی وان
میٹرو میں جو چائے پلائے بس وہ باپ سمان
سب سے اچھا شاعر وہ ہے جس کا یار مدیر
روئے بھگت کبیر

سڑکوں پر بھو کے پھرتے ہیں شاعر موسیقار
ایکٹرسوں کے باپ لیے پھرتے ہیں موٹر کار
فلم نگر تک آ پہنچے ہیں سیّد پیر فقیر
روئے بھگت کبیر

لال دین کی کوٹھی دیکھی رنگ بھی جس کا لال
شہر میں رہ کر خوب اُڑائے دہقانوں کا مال
اور کہے اجداد نے بخشی مجھ کو یہ جاگیر
روئے بھگت کبیر

جس کو دیکھو لیڈر ہے اور جس سے ملو وکیل
کسی طرح بھرتا ہی نہیں ہے پیٹ ہے ان کا جھیل
مجبوراً سننا پڑتی ہے ان سب کی تقریر
روئے بھگت کبیر

محفل سے جو اُٹھ کر جائے کہلائے وہ لور
اپنی مسجد کی تعریفیں باقی جُوتے چور
اپنا جھنگ بھلا ہے پیارے جہاں ہماری ہیر
روئے بھگت کبیر

بھئے کبیر اُداس

اِک پٹڑی پر سردی میں اپنی تقدیر کو روئے
دُوجا زلفوں کی چھاؤں میں سکھ کی سیج پر سوئے
راج سنگھاسن پر اک بیٹھا اور اک اس کا داس
بھئے کبیر اُداس

اُونچے اُونچے ایوانوں میں مُورکھ حکم چلائیں
قدم قدم پر اس نگری میں پنڈت دھکے کھائیں
دھرتی پر بھگوان بنے ہیں دھن ہے جن کے پاس
بھئے کبیر اُداس

گیت لکھائیں پیسے نا دیں فلم نگر کے لوگ
ان کے گھر باجے شہنائی لیکھک کے گھر سوگ
گائک سُر میں کیوں کر گائے کیوں نا کاٹے گھاس
بھئے کبیر اُداس

کل تک تھا جو حال ہمارا حال وہی ہے آج
جالب اپنے دیس میں سکھ کا کال وہی ہے آج
پھر بھی موچی گیٹ پہ لیڈر روز کریں بکواس
بھئے کبیر اُداس

یہ وزیرانِ کرام

کوئی ممنون فرنگی کوئی ڈالر کا غلام
دھڑکنیں محکوم ان کی لب پہ آزادی کا نام
ان کو کیا معلوم کس عالم میں رہتے ہیں عوام
یہ وزیرانِ کرام

ان کو فرصت ہے بہت اونچے امیروں کے لیے
ان کے ٹیلیفون قائم ہیں سفیروں کے لیے
وقت ان کے پاس کب ہے ہم فقیروں کے لیے
چھو نہیں سکتے انہیں ہم ان کا اونچا ہے مقام
یہ وزیرانِ کرام

صبح چائے ہے یہاں تو شام کھانا ہے وہاں
کیوں نہ ہوں مغرور چلتی ہے میاں ان کی دکاں
جب یہ چاہیں ریڈیو پر جھاڑ سکتے ہیں بیاں
ہم ہیں پیدل، کار پر یہ، کس طرح ہوں ہمکلام

یہ وزیرانِ کرام

قوم کی خاطر اسمبلی میں یہ مر جاتے بھی ہیں
قوتِ بازو سے اپنی بات منواتے بھی ہیں
گالیاں دیتے بھی ہیں اور گالیاں کھاتے بھی ہیں
یہ وطن کی آبرو ہیں، کیجئے ان کو سلام

یہ وزیرانِ کرام

ان کی محبوبہ وزارت داشتائیں کرسیاں
جان جاتی ہے تو جائے پر نہ جائیں کرسیاں
دیکھئے یہ کب تلک یوں ہی چلائیں کرسیاں
عارضی ان کی حکومت عارضی ان کا قیام

یہ وزیرانِ کرام

پسِ دیوارِ زنداں

اپنی آہوں کا ستم گریہ اثر ہونے تک !
ہم کو جلنا ہے یونہی رات بسر ہونے تک

صرف سودا ہی ضروری نہیں دیوانوں میں
سر بھی درکار ہیں دیوار کو در ہونے تک

○

میری بچّی

اُس کو شاید کھلونا لگی ہتھکڑی
میری بچّی مجھے دیکھ کر ہنس پڑی

یہ ہنسی تھی سحر کی بشارت مجھے
یہ ہنسی دے گئی کتنی طاقت مجھے

کس قدر زندگی کو سہارا مِلا
ایک تابندہ کل کا اشارہ مِلا

○

کتنا سکوت ہے رسن و دار کی طرف
آتا ہے کون جرأتِ اظہار کی طرف

دشتِ وفا میں آبلہ پا کوئی اب نہیں
سب جا رہے ہیں سایۂ دیوار کی طرف

قصرِ شہی سے کہتے ہیں نکلے گا مہرِ نو
اہلِ خرد ہیں اس لیے سرکار کی طرف

دشتِ شام و کوریا سے عدو کو نکال لیں
آئیں گے لوٹ کر لب و رخسار کی طرف

باقی جہاں میں رہ گیا غالبؔ کا نام ہی
ہر چند اک ہجوم تھا اغیار کی طرف

○

بھیگیں نہ آنسوؤں سے کنارے سویز کے
بہتے رہیں سکون سے دھارے سویز کے
بجھنے نہ پائے موجِ ہوائے یہود سے
اِک جوت جگ رہی ہے سہارے سویز کے
دائم فضا میں پرچمِ نصرت رہے بلند
موتی یونہی لٹائیں نظارے سویز کے

عقبیٰ کا ہے خیال تو عقبہ کا ساتھ دو
ٹوٹے ہوئے دلوں کی تمنا کا ساتھ دو
ناطہ ہر ایک توڑ کے افرنگیوں سے آج
خود دار ہو تو مشرقِ وسطیٰ کا ساتھ دو
مغرب کے رہزن کا جنوں پھر ہے جوش پر
گر امن چاہتے ہو تو دنیا کا ساتھ دو

صحافی سے

قوم کی بہتری کا چھوڑ خیال
فکرِ تعمیرِ ملک دل سے نکال
تیرا پرچم ہے تیرا دستِ سوال
بے ضمیری کا اور کیا ہو مآل
اب قلم سے ازاربند ہی ڈال

تنگ کر دے غریب پر یہ زمیں
خم ہی رکھ آستانِ زر پہ جبیں
عیب کا دور ہے ہنر کا نہیں
آج حسنِ کمال کو ہے زوال
اب قلم سے ازاربند ہی ڈال

کیوں یہاں صبحِ نو کی بات چلے
کیوں ستم کی سیاہ رات ڈھلے
سب برابر ہیں آسماں کے تلے
سب کو رجعت پسند کہہ کر ٹال
اب قلم سے ازاربند ہی ڈال

نام سے پیشتر لگا کے امیر
ہر مسلمان کو بنا کے فقیر
قصر و ایوان میں ہو قیام پذیر
اور خطبوں میں دے عمرؓ کی مثال
اب قلم سے ازاربند ہی ڈال

آمریت کی ہم نوائی میں
تیرا ہمسر نہیں خدائی میں
بادشاہوں کی رہنمائی میں

روز اسلام کا جلوس نکال
اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

لاکھ ہونٹوں پہ دم ہمارا ہو
اور دل صبح کا ستارا ہو
سامنے موت کا نظارا ہو
لکھ یہی ٹھیک ہے مریض کا حال
اب قلم سے ازار بند ہی ڈال

○

اے دوست رہِ زیست میں زنداں نہ رہیں گے
آئے گی سحر، لوگ پریشاں نہ رہیں گے

صیّاد کے ہم پنجۂ بیداد سے ڈر کر
تزئینِ گلستاں سے گریزاں نہ رہیں گے

ہم دہر میں انساں کی عظمت کا نشاں ہیں
ہم ہوں گے مگر دشمنِ انساں نہ رہیں گے

صدیوں کی سیہ رات ہے اب ڈھلنے پہ مجبور
اشکوں کے ستارے سرِ مژگاں نہ رہیں گے

ان قصر نشینوں سے ہے بیزار زمانہ
یہ میر و وزیر اور یہ سلطاں نہ رہیں گے

اِک راہ پہ مل کر ہمیں چلنے کی ہے بس دیر
کچھ لوگ نمایاں ہیں نمایاں نہ رہیں گے

اس دَور کے ممتاز ادیبوں کو بتا دو
تاریخ میں شاہوں کے ثنا خواں نہ رہیں گے

مادرِ ملّت کی پہلی برسی پر

بجا کہ دار و رسن ہیں صلہ صداقت کا
نہ رک سکے گا مگر قافلہ صداقت کا
نہ ختم ہو گا کبھی سلسلہ صداقت کا
کہ آگ میں بھی گلستاں کھلا صداقت کا
ہوئی شکست نہ ہو گی کبھی اصولوں کو
بقا ملی ہے سدا امن کے رسولوں کو

ہے آج سارے وطن کی زباں پہ نام اس کا
وہ مر گئی ہے مگر زندہ ہے پیام اس کا
یونہی رہے گا ہر اک دل میں احترام اس کا
بلند رکھیں گے پرچم سدا عوام اس کا
نشاں تمہارا نہ ہو گا ذرا سرو تو سہی
فرازِ جادہ سے نیچے قدم دھرو تو سہی

وہ نقشِ قائدِ اعظم اُبھارنے آئی
وہ رنگِ روئے گلستاں نکھارنے آئی
مقدّرِ اہلِ وطن کا سنوارنے آئی
وہ اپنی جان غریبوں پر وارنے آئی
اُسے نہ جاہ و زر و مال کی ضرورت تھی
فقط عوام کے اقبال کی ضرورت تھی

اُٹھی عوام کو ہر گام پر جگاتی ہوئی
ہر اک نگاہ میں شمعِ یقیں جلاتی ہوئی
غرورِ کج کلہاں خاک میں ملاتی ہوئی
پیام سب کو مساوات کا سناتی ہوئی
تھا اُس کا نعرہ کہ ہے ذاتِ وطن سے پہلے
صدا یہ گونج اٹھی آمروں کے دل دہلے

وطن کے حاکمِ اعلیٰ ہیں دس کروڑ انساں
یہ کہہ کے بخش دی اُس نے خموشیوں کو زباں
دل و نگاہ میں عزم و عمل کا تھا طوفاں
علم اُٹھائے نکل آئے رن میں پیر و جواں
ادھر حسین نہتّے ادھر تھیں شمشیریں
کٹی نہیں تو کٹیں گی ضرور زنجیریں

ملوں کے مالکو اے افسرو زمیندارو
ہماری راہِ ترقّی ہیں کالی دیوارو
کرو گے ہم پہ ستم کب تلک ستم گارو
ہو چند روز ہی تم سیم و زر کے بیمارو
نشاں یزید کا باقی ہے اور نہ زار کا ہے
یہ دَور اصل میں انساں کے وقار کا ہے

غلام ہم کو بنائے رہو گے تم کب تک
ہمارے سر کو جھکائے رہو گے تم کب تک
ہمارے حق کو دبائے رہو گے تم کب تک
وطن کو سُولی چڑھائے رہو گے تم کب تک
اندھیرا ظلم و ستم کا مِٹا کے چھوڑیں گے
چراغِ مادرِ ملّت جلا کے چھوڑیں گے

تیز چلو !

یہ کہہ رہا ہے دلِ بیقرار تیز چلو
بہت اُداس ہیں زنجیر و دار تیز چلو

جو تھک گئے ہیں انہیں گردِ راہ رہنے دو
کسی کا اب نہ کرو انتظار تیز چلو

خزاں کی شام کہاں تک رہے گی سایہ فگن
بہت قریب ہے صبحِ بہار تیز چلو

تمہی سے خوف زدہ ہیں زمین و زلزلے
تمہی ہو چشمِ ستم گر پہ بار تیز چلو

کرو خلوص و محبت کو رہنما اپنا
نہیں درست دلوں میں غبار تیز چلو

بہت ہیں ہم میں یہاں لوگ گفتگو پیشہ
ہے اِن کا صرف یہی کاروبار تیز چلو

خِرد کی سُست روی سے کسے ملی منزل
جنوں ہی اب تو کرو اختیار تیز چلو

سلام لوگو!

سلام اے دل فگار لوگو!
سلام اے اشکبار لوگو

تمہی نے اپنا وطن بچایا — تمہی نے باطل کا سر جھکایا
بُجھا کے شمعِ حیات اپنی — وفا کی راہوں کو جگمگایا
مگر یہ دِل رو کے کہہ رہا ہے — لہُو تمہارا نہ رنگ لایا

وہی ہے شب کا حصار لوگو
سلام اے اشکبار لوگو

گلوں کی وادی لہو لہُو ہے — فغاں کی آواز چار سُو ہے
ہیں اِس قدر تشنہ کام میکش — ہر ایک لب پر سبُو سبُو ہے
نشانِ منزل ہے کھو یا کھویا — لُٹا لُٹا شہر آرزو ہے

بُجھے بُجھے ہیں دیار لوگو!
سلام اے اشکبار لوگو

تمہارے دم سے ہری زمینیں خوشی سے دامن بھری مشینیں
ہیں اس کے باوصف بھیگی بھیگی تمہاری اشکوں سے آستینیں
میں سوچتا ہوں رہیں گی کبتک ستم کے آگے جھکی جبینیں!
اُٹھاؤ سر سوگوار لوگو!
سلام اے اشکبار لوگو

کوچۂ صبح میں جا پہنچے ہم
صورتِ موجِ صبا پہنچے ہم

نزہتِ گُل کا پیام آیا تھا
لاکھ تھے آبلہ پا، پہنچے ہم

○

تیری بستی میں جدھر سے گزرے
ہائے کیا لوگ نظر سے گزرے

کتنی یادوں نے ہمیں تھام لیا
ہم جو اس راہ گزر سے گزرے

○

سو گئے انجمِ شب یاد نہ آ
اے مری جانِ طرب یاد نہ آ

میری پتھرائی ہوئی آنکھوں میں
کوئی آنسو نہیں اب یاد نہ آ

○

ڈوب جائے گا آج بھی خورشید
آج بھی تم نظر نہ آؤ گے
بیت جائے گی اس طرح ہر شام
زندگی بھر ہمیں رُلاؤ گے

○

غم کے سانچے میں ڈھل سکو تو چلو
تم مرے ساتھ چل سکو تو چلو
دُور تک تیرگی میں چلنا ہے
صُورتِ شمع جل سکو تو چلو

○

دوست تو مشورے نہ دو مجھ کو
مشوروں سے دماغ جلتا ہے
یہ کسی نے غلط کہا تم سے
اِن کھلونوں سے جی بہلتا ہے

○

رنگ و بُوئے گلاب کہہ لوں گا
موجِ جامِ شراب کہہ لوں گا
لوگ کہتے ہیں تیرا نام نہ لوں
میں تجھے ماہتاب کہہ لوں گا

○

سبزہ زاروں میں گزر تھا اپنا
مست و شاداب نگر تھا اپنا
جب اٹھاتا ہے کوئی محفل سے
یاد آتا ہے کہ گھر تھا اپنا

تجھے پایا کہ تجھ کو کھو دیا ہے
یہ اکثر سوچ کر دل رو دیا ہے
ہمارا داغِ دل جائے نہ جائے
ترا دامن تو ہم نے دھو دیا ہے

○

جہاں آساں تھا دن کو رات کرنا
وہ گلیاں ہو گئی ہیں ایک سپنا
اب ان کی یاد ہے پلکوں پہ روشن
اب ان کو کہہ نہیں سکتے ہم اپنا

○

دیارِ سبزہ و گل سے نکل کر
دل و جاں نذرِ صحرا ہو گئے ہیں
کہاں وہ چاند سی ہنستی جبینیں
گھنی تاریکیوں میں کھو گئے ہیں

مُدّتیں ہو گئیں خطا کرتے
شرم آتی ہے اب دُعا کرتے
چاند تارے بھی اُن کا اے جالبؔ
تھرتھراتے ہیں سامنا کرتے

○

نِت نئے شہر نِت نئی دُنیا
ہم کو آوارگی سے پیار رہا
ان کے آنے کے بعد بھی جالبؔ
دیر تک ان کا اِنتظار رہا

○

زُلف کی بات کئے جاتے ہیں
دن کو یُوں رات کئے جاتے ہیں
چند آنسو ہیں اِنھیں بھی جالبؔ
نذرِ حالات کئے جاتے ہیں

میں بھی ہوں تیری طرح سے آوارہ و بیکار
اُڑتے ہوئے پتّے مجھے ہمراہ لیے چل

○

مرا قصور کہ میں ان کے ساتھ چل نہ سکا
وہ تیز گام مرا انتظار کیوں کرتے

○

کسے خبر تھی ہمیں راہبر ہی لوٹیں گے
بڑے خلوص سے ہم کارواں کے ساتھ رہے

○

ہم اُن نجوم کی تابش بھی چھین سکتے ہیں
بنا دیا ہے جنہیں فخرِ آسماں ہم نے

○

شہر سے بستی سے ویرانے سے جی گھبرا گیا
اے جنوں تیرے ہر افسانے سے جی گھبرا گیا

اک مکمّل خامشی اِک بیکراں گہرا سکوت
آج صحرا کا بھی دیوانے سے جی گھبرا گیا

پھر گئے جا لب نگاہوں میں کئی اُجڑے چمن
موسمِ گُل کا خیال آنے سے جی گھبرا گیا

○

○

ابھی اے دوست ذوقِ شاعری ہے وجہِ رسوائی
تری بستی میں ہم پر اور بھی الزام آئیں گے

اگر اب بھی ہمارا ساتھ تو اے دل نہیں دے گا!
تو ہم اس شہر میں تجھ کو اکیلا چھوڑ جائیں گے

○

خامشی سے ہزار غم سہنا
کتنا دشوار ہے غزل کہنا

○